امیر المجاہدین شیخ الحدیث استاذ العلماء علامہ حافظ خادم حسین رضوی دامت برکاتہم العالیہ

کا ماں کی آغوش سے لے کر سیاست کی پر خار وادی تک کا سفر زندگی خود اُنہی کی زبانی بنام

علامہ خادم حسین رضوی کا سفر زندگی

باہتمام: مفتی محمد آصف عبداللہ قادری رضوی

بزم رضویہ اہلسنت وجماعت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ

میں نے ضلع اٹک کے گاؤں نکا کلاں کے ایک زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ سن تھا 1966ء۔ ہمارے گاؤں کے نزدیک مشہور توت آئل فیلڈ ہے۔ یہ فیلڈ 1960ء کے اوائل میں دریافت ہوئی تھی جبکہ اس فیلڈ سے کمرشل پروڈکشن کا آغاز 1967ء میں ہوا۔

ہم کل دو بھائی اور چار بہنیں ہیں۔ میں نے گاؤں کے اسکول میں چار جماعتیں پڑھیں۔ پانچویں کلاس کی کتابیں خریدی ضرور تھیں، لیکن اس سے پہلے ہی دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے جہلم چلا گیا۔ میں نے اٹک سے جہلم کے لئے رخت سفر جون 1974ء میں باندھا۔ عمر بمشکل آٹھ برس ہوگی۔ یوں اپنے بچپن اور لڑکپن کا ایک حصہ میں نے جہلم میں گزارا۔ دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر واقع اس شہر سے میری کئی ابتدائی یادیں وابستہ ہیں۔ جب میں اکیلا جہلم پہنچا تو اس وقت تحریک ختم نبوت ﷺ اپنے عروج پر تھی۔ جلسے جلوس اور پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ جہلم میں ہمارے گاؤں کے استاد حافظ غلام محمد صاحب تھے۔ وہ مجھے مدرسہ جامع غوثیہ اشاعت العلوم عیدگاہ لے گئے۔ یہ مدرسہ قاضی غلام محمود صاحب کا تھا جو پیر مہر علی شاہ علیہ الرحمہ کے مرید خاص تھے۔ وہ خطیب و امام تھے۔ ان کے بیٹے قاضی حبیب الرحمن مدرسے کے منتظم ہوا کرتے تھے۔ مدرسے میں جن استاد سے میں نے حفظ قرآن کا آغاز کیا، ان کا نام قاری غلام یٰسین تھا۔ وہ نابینا تھے۔ گجرات سے تعلق تھا۔ بعد میں قاضی امانت علی صاحب مجھے حفظ کراتے رہے۔ ایک روز مدرسے میں لڑائی ہوگئی۔ مدرسے میں ہم ایک ہی گاؤں کے کوئی اکیس بیس طلباء تھے۔ ان میں سے ہی ایک طالب علم گل محمد نے کسی بات پر باورچی کو مارا تھا۔ باورچی کو خاصی چوٹیں آئیں۔ اس واقعہ پر گل محمد کو مدرسے سے نکالا جا رہا تھا تو ہمارے استاد، جو گاؤں سے ہم سب طلباء کو لے کر آئے تھے۔ انہوں نے ہمیں مشین محلہ نمبر ایک پر واقع دار العلوم میں داخلہ دلا دیا۔ بارہ سپارے میں نے جامع غوثیہ اشاعت العلوم میں حفظ کر لئے تھے۔ باقی اٹھارہ پارے مشین محلہ نمبر ایک کے

دار العلوم میں حفظ کئے۔ یوں چار برس کے عرصے میں، میں نے قرآن پاک حفظ کیا۔ اس وقت میری عمر بارہ برس کے لگ بھگ تھی۔ قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد میں دینہ چلا گیا۔ یہ ضلع گجرات کا ہی ایک گرشل قصبہ ہے۔ وہاں دو برس تک قرأت پڑھی۔ پھر 1980ء میں لاہور آ گیا اس کے بعد زندگی کا بیشتر حصہ لاہور میں گزرا۔

جہلم شہر اور پھر دینہ میں بچپن اور لڑکپن کا ابتدائی دور، مدرسے کی منظم زندگی میں گزرا۔ وقت پر اٹھنا، پڑھنا اور پھر سو جانا۔ شرارتیں کی نہ لڑتا جھگڑتا تھا۔ اس کا وقت بھی نہیں ملتا تھا کہ زیادہ تا تم تو پڑھائی میں گزر جاتا تھا۔ ہاں ! بچپن کا ایک معمول آج تک مجھے یاد ہے۔ میں ہر رات سورۃ محمد شریف پڑھ کر سویا کرتا تھا۔ یہ مجھے کسی استاد یا پیر نے نہیں بتایا تھا۔ بس یہ بات کسی طرح میرے دل میں آ گئی تھی جو پھر میری زندگی کا حصہ بن گئی۔ سونے سے پہلے میں وضو کرتا اور دو زانو ہو کر چار پائی پر بیٹھ جاتا پھر سورۃ محمد شریف پڑھ کر سوتا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے البتہ کبھی کبھی بھول جاتا ہوں، لیکن آج بھی سونے سے پہلے تین بار تسبیح فاطمہ ضرور پڑھتا ہوں۔ تینتیس بار سبحان اللہ، تینتیس بار الحمد للہ اور چونتیس بار اللہ اکبر۔ یہ مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کا بھی معمول تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ جنگ صفین کے موقع پر میں پہلی رات یہ بھول گیا تھا۔ رات کے آخری حصے میں یاد آیا تو فوری طور پر تسبیح پڑھی، جو صحت اور جسم کی درستگی کے لئے بڑی ضروری ہے۔

میں لاہور آیا تو اس وقت زندگی کی 14 بہاریں دیکھ چکا تھا۔ یہاں بھی معمولات زندگی میں زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔ مدرسے میں پڑھنے کے بعد شام کو پانچ بجے چھٹی ہوتی تو میں اکیلا ہی عصر کے بعد سیر کے لئے مینار پاکستان چلا جاتا تھا۔ یہ تقریباً روز کا معمول تھا۔ آج بھی مجھے وہ مناظر یاد ہیں۔ وہاں ایک ٹیم والی بال کھیلا کرتی تھی۔ میں وہاں کھڑا انہیں والی بال کھیلتے دیکھا کرتا۔ جب سورج غروب ہونے لگتا تو پیدل واپسی کی راہ لیتا۔ سوتر منڈی کے علاقے میں ایک مسجد تھی، وہاں قاضی عبد القیوم صاحب تھے۔ مغرب کی نماز میں ان کے پیچھے پڑھتا تھا۔ سیر کے لئے روز مینار پاکستان جانا اور والی بال دیکھنا، یہ ان دنوں میری غیر نصابی سرگرمیاں ہوا کرتی تھیں۔ باقی خود کوئی کھیل میں نے نہیں کھیلا۔ کوئی شوق ہی نہیں ہوا، کرکٹ سے تو ہمیشہ چڑ رہی۔

دنیا کی ہر ماں کی طرح والدہ مجھ سے بے پناہ محبت کیا کرتی تھی۔ ساری عمر میرا بہت خیال رکھا لیکن میں زیادہ قریب اپنے والد لعل خان کے تھا۔ وہ مجھ سے بے حد درجہ پیار تو کیا ہی کرتے تھے، میرے حوالے سے بہت زیادہ حساس بھی تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کسی کو میرے آگے اونچا نہیں بولنے دیا کرتے تھے۔ ان کے سامنے کسی کی مجال نہیں تھی کہ مجھ سے بلند آواز سے بات کرلے۔ والد صاحب کے ایک بچپن کے دوست محمد نواز ہوا کرتے تھے۔ وہ دوسری جنگ عظیم میں فوجی تھے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ انہوں نے ایک روز والد صاحب کی موجودگی میں مجھے طنزاً صوفی کہہ دیا۔ اس پر والد صاحب اتنا برہم ہوئے کہ اسے مارنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ بولے اس کی جرأت کیسے ہوئی کہ میرے بیٹے کو طنزاً مخاطب کرے۔ قصہ مختصر، نواز صاحب کو معافی مانگ کر جان چھڑانی پڑی تھی۔ میں لاہور میں تھا تو والد صاحب اٹک سے میرے لئے وافر مقدار میں دیسی گھی ڈبوں میں بھر کر لایا کرتے تھے۔ گاؤں کی عورتیں کہتیں آپ اتنا گھی کھاتے ہیں؟ کہتے کہ میرا بیٹا ڈالڈا گھی نہیں کھاتا۔ اس کے لئے لے کر جارہا ہوں۔ آج بھی میں دیسی گھی ہی کھاتا ہوں۔ کبھی ڈالڈا گھی چکھا تک نہیں۔ میرے لئے گاؤں سے لاہور دیسی گھی لانا والد صاحب کا معمول تھا۔ میرے برسر روزگار ہونے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا، لیکن اس کا ایک پیسہ بھی کبھی انہوں نے مجھ سے نہیں لیا۔ اگر پوچھا جائے کہ اس کے عوض میں نے ان کی کیا خدمت کی؟ تو جواب ہے کہ وہ اپنی خدمت کراتے ہی نہیں تھے۔ صرف یہ کہتے کہ جس کام کے لئے ہم نے آپ کو تیار کیا ہے، وہ کام کرو۔ والد صاحب نے مجھ سے اپنے لئے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ میں نے زبردستی کچھ دینا بھی چاہا تو انکار کردیا۔ البتہ کبھی موڈ میں ہوتے تو جو واسکٹ میں نے پہنی ہوتی تھی، کہتے کہ......''یار، یہ مجھے دے دے، اچھی لگ رہی ہے'' میں کہتا کہ نئی لادیتا ہوں۔ اصرار کرتے کہ یہی چاہئے۔ میں اکثر براؤن رنگ کی ٹوپی پہنا کرتا تھا۔ کبھی کبھار یہ ٹوپی بھی مانگ لیا کرتے تھے۔ کہتے کہ اس کا رنگ ایسا ہے کہ بالوں میں تیل لگانے سے میلی نہیں ہوتی۔ وہ ''تارے میرے'' کا تیل لگایا کرتے تھے۔ آج میں بھی ان کی تقلید میں سر پر یہی تیل لگاتا ہوں۔ ''تارے میرے'' کا تیل جلن بہت مچاتا ہے۔ لگانے والے کو تقریباً ایک گھنٹہ بعد ہی قرار آتا ہے۔

میرے بارے میں اس قدر حساس اور مجھ سے اتنا زیادہ پیار کرنے والے والد کی شخصیت کا یہ بھی

ایک دلچسپ پہلو تھا کہ وہ کبھی میرا بیگ اٹھا کر بسوں کے اڈے تک مجھے چھوڑنے نہیں آئے۔ جب بھی چھٹیاں گزار کر میں اٹک سے واپس جہلم جاتا تو ہمیشہ میری والدہ بیگ اٹھا کر بس کے اڈے تک مجھے چھوڑنے آیا کرتی تھیں۔

والد کا انتقال 2008ء میں ہوا۔ میں کشمیر میں تقریر کر کے واپس لاہور آ رہا تھا۔ راستے میں والد صاحب کا فون آیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے اپنے ڈرائیور کو کہا کہ گاؤں چلو۔ فجر کے بعد گاؤں پہنچا۔ والد صاحب مجھے حافظ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو میری بھتیجی کو والد صاحب نے کہا کہ حافظ آیا ہے، دروازہ کھولو۔ وہ بیمار نہیں تھے لیکن ان کی طبیعت عجیب ہو رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان کا آخری وقت آ گیا ہے۔ مجھے بڑی محبت سے اٹھ کر ملے۔ میں نے گھر والوں سے کہا کہ مجھے پیاز اور دال والی روٹی پکا کر دو۔ والد صاحب نے میری بھابھی کو کہا کہ سارا سامان میں تیار کرتا ہوں، پھر تم روٹی پکا دینا۔ اس دوران میری آنکھ لگ گئی۔ دھوپ آ گئی تو والد صاحب نے آگے کپڑا ڈال دیا۔ روٹی پکنے پر مجھے جگایا۔ ظہر تک مجھ سے گفتگو کرتے رہے۔ زیادہ ماضی کی باتیں زیرِ بحث رہیں۔ جب میں گاؤں آتا تو والد صاحب کہتے تھے کہ باجماعت نماز پڑھاؤ، لیکن اس روز انہوں نے یہ بات نہیں کی۔ بڑی مشکل سے اٹھ کر وضو کیا۔ عصر کے وقت میں نے کہا کہ لاہور چلا جاؤں تو کہنے لگے کہ ہاں چلے جاؤ۔ اب میری طبیعت ٹھیک ہے اور ساتھ ہی میری گردن پر ہمیشہ کی طرح بوسہ دیا۔ مجھے ایک کرنٹ سا محسوس ہوا۔ وہ پہلے بھی بوسہ دیا کرتے تھے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ شاید یہ آخری ملاقات ہے۔ پھر یہی ہوا، رات گزری تو دوسرے روز ظہر کے وقت ان کا انتقال ہو گیا۔ چارپائی پر بیٹھے تھے، اچانک پیچھے کی جانب گر گئے۔ یہ میری زندگی کا مشکل ترین مرحلہ تھا کہ ایک سائبان سر سے اٹھ گیا تھا۔

میری والدہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ لیکن کمال کی فہم و فراست رکھتی تھیں۔ ان کی باتیں آج بھی میرے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اپنی گفتگو کے دوران موقع کی مناسبت سے میں پنجابی کا جو محاورہ "پیڑاں ہور تے پھکیاں ہور" استعمال کرتا ہوں۔ یہ دراصل میری والدہ کا تکیہ کلام ہوا کرتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ درد اور ہے، دوائیاں اور۔ یعنی جب ایک شخص کوئی بات کر کے اس کے

پردیس میں کسی پرائی بات کا بدلہ اتارنے کی کوشش کرے تو پھر یہ محاورہ استعمال کیا جاتا ہے۔ کوئی رشتہ دار اس نوعیت کی ''کاریگری'' دکھانے کی کوشش کرتا تو والدہ عموماً یہی محاورہ استعمال کیا کرتی تھیں۔ اسی طرح میں جہلم پڑھنے گیا تو ایک برس بعد ہی گھبرا گیا۔ گھر والے یاد آنے لگے۔ والدہ کو خط لکھا کہ میں واپس آ رہا ہوں۔ پردیس برداشت نہیں ہوتا۔ والدہ صاحبہ نے میرے بڑے بھائی امیر حسین کو کہا کہ خادم حسین کو خط لکھو۔ بھائی نے خط لکھ لیا تو کہا کہ ساتھ میں پنجابی کا ماہیا بھی لکھو، جو اس طرح تھا۔

''کالے لکاں ماہیا اوڑے دل کریئے۔ پردیس کٹن دے تاں ماہیا''

(پرائے دیس میں وقت کاٹنے کے لئے دل بڑا رکھنا پڑتا ہے)

والدہ صاحبہ مجھے اکثر یہ بھی فرمایا کرتی تھیں کہ ''جوان اور گھوڑے کا کوئی وطن نہیں ہوتا۔ جوان اور گھوڑا جس طرف رخ کرے ان کا وہی وطن ہے''

میں چھٹیوں میں گاؤں آتا تو ایک دن پہلے والدہ کپڑوں کی ادھڑی سلائیاں اور ٹوٹے بٹن لگا دیا کرتی تھیں۔ پھر گندم اور چنے سے بنی پنجاب کی روایتی گزک، جسے ''مرونڈا'' کہتے ہیں، میرے لئے خاص طور پر بنائی جاتی۔ یہ اس زمانے میں بڑی سوغات ہوا کرتی تھی۔ چھٹیاں ختم ہو جاتیں تو میرا اسٹری بیگ اٹھا کر مجھے بس کے اڈے تک چھوڑنے آتیں۔ میں اکثر منع کرتا کہ وہاں مرد حضرات وغیرہ ہوتے ہیں۔ آپ جا کر کیا کریں گی۔ والدہ کہتیں کہ ''میں دور بیٹھ جاتی ہوں، دیکھتی رہتی ہوں کہ اب میرا بیٹا گاڑی میں بیٹھ گیا ہے اور جب گاڑی آگے جا کر فلاں گاؤں کے قریب جا کر ہارن بجاتی ہے تو میں سمجھ جاتی ہوں کہ میرا بیٹا تو ت (آئل فیلڈ) پر پہنچ گیا ہے۔ پھر میں واپس گھر روانہ ہو جاتی ہوں'' اس ہارن کے بجنے تک والدہ بس کے اڈے پر کھڑی رہتی تھیں۔ والد کے انتقال کے تقریباً دو برس بعد وہ بھی خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ لیکن ان کی یادیں میرے لئے اندھیرے میں چمکتے جگنو کی طرح ہیں۔ میں آج بھی سوچتا ہوں کہ ایکسیڈنٹ میں میرے مفلوج ہونے کا دکھ ماں کو لے بیٹھا۔ اگرچہ میرے سامنے کبھی والدہ صاحبہ نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ میرے سامنے تو وہ ہمیشہ ایک بہادر ماں کی طرح حوصلہ دلانے والی باتیں کیا کرتی تھیں۔ لیکن میں نے کئی بار ان آنکھوں سے انہیں آنکھ ملتے دیکھا۔ ٹھنڈی آہیں بھرتے سنا۔ یقیناً اپنے جوان بیٹے کے یکدم بستر سے لگ جانے کا دکھ انہیں تھا، جس کا ذکر وہ نہیں کرتی تھیں۔

حادثے کے بعد ایک بار میں نے والدہ سے کہا آپ میرے لئے دعا نہیں مانگتیں، کہنے لگیں مانگتی ہوں۔ میں نے کہا کہ پھر قبول کیوں نہیں ہوئی۔ فرمانے لگیں "جس لائن میں ہم لگے ہیں اس میں آگے موجود مریض ہم سے زیادہ تکلیف میں ہیں۔ جب ان کا کام ہو جائے گا تو ہمارا کام بھی ہو جائے گا۔ کیونکہ ہمارا دکھ ان سے بڑا نہیں ہے" اس بات سے مجھے بڑا حوصلہ ملا۔

اگرچہ میں والد کے زیادہ قریب تھا، لیکن سچ پوچھو تو عشق رسول ﷺ مجھے اپنی ماں کے گود سے ملا ہے۔ میری والدہ اٹھتے بیٹھتے ہر بات میں "صدقے یا رسول اللہ" کہا کرتی تھیں۔ یہ جملہ میرے لاشعور میں بس گیا۔ علامہ اقبال بھی اپنے ایک فارسی شعر میں کہتے ہیں کہ (ترجمہ) "یہ جو عشق رسول ﷺ مجھے ملا ہے، یہ میری ماں کی گود اور دعا سے ملا ہے۔ اسکولوں میں نہ دل کھلتا ہے، نہ آنکھ کھلتی ہے، وہاں صرف یہ جادوگری سکھائی جاتی ہے کہ کمانا کیسے ہے"

حادثے میں معذور ہو جانا میری زندگی کا ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ یہ حادثہ والد صاحب کے انتقال کے تقریباً ایک برس بعد پیش آیا۔ 2009ء کا سال تھا۔ بڑے بھائی امیر حسین گاؤں میں ایک مسجد تعمیر کرا رہے تھے۔ میں اسی سلسلے میں گاؤں جا رہا تھا۔ فجر کی نماز میں نے کلر کہار کے نزدیک بھیرہ کے مقام پر پڑھی۔ اس دن نجانے کیوں میرا دل اضطراب میں تھا۔ راستے میں ایک ہوٹل آتا ہے۔ چائے بہت اچھی بناتا ہے۔ وہاں میں نے اپنی گاڑی رکوانے کی کوشش کی لیکن نہ روک سکا۔ ہمارے شاہ صاحب کا ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا۔ آگے ایک سی این جی پمپ آیا۔ وہاں گاڑی رکوائی اور واش بیسن پر جا کر وضو کرنے لگا۔ یہ آخری بار تھا، جب میں نے کھڑے ہو کر وضو کیا۔ ساتھ ہی مسجد تھی۔ میں نے ایک قدم مسجد کی طرف اٹھایا کہ نفل پڑھ لوں۔ پھر سوچا کہ چلتی گاڑی میں نفل ہو جاتے ہیں۔ بس یہی وقت تھا میرے حادثے کا۔ اگر نفل پڑھنے کے لئے مسجد میں داخل ہو جاتا تو شاید حادثے سے بچ جاتا۔ لیکن "اگر" کہنے سے حضور ﷺ نے منع فرمایا ہے لہذا میں اس "اگر" پر زیادہ نہیں سوچتا۔ قصہ کوتاہ، جب سی این جی اسٹیشن سے ہماری گاڑی روانہ ہوئی تو کچھ آگے جا کر ایک موڑ کے نزدیک ڈرائیور اونگھ گیا۔ اس موڑ سے گزرتے ہوئے میں آج بھی توبہ استغفار کرتا ہوں۔ اتنا بڑا موڑ بھی نہیں تھا، لیکن جب وہ موڑ آیا تو میں نے دیکھا کہ ڈرائیور گاڑی سیدھی لے کر جا رہا ہے۔ میں نے ڈرائیور کو تیزی سے مخاطب کرتے

ہوئے کہا — "کیا کر رہے ہو؟" بس یہ جملہ کہنے کی مہلت مل سکی اور گاڑی نیچے جا گری۔ ڈرائیور کو کچھ ہوا نہ گاڑی کو نقصان پہنچا۔ دونوں سلامت رہے، لیکن میرے سر میں شدید چوٹ لگی اور حرام مغز بری طرح متاثر ہوا۔ اس کے نتیجے میں میرے دھڑ کا نچلا حصہ مکمل طور پر مفلوج ہو گیا۔ اب تو میری ٹانگوں میں کافی حرکت ہوتی ہے، لیکن پہلے نچلا دھڑ اس قدر سن ہو گیا تھا کہ کوئی چٹکی بھی بھرے تو احساس نہیں ہوتا تھا۔ حادثے کے وقت میں درود شریف پڑھ رہا تھا۔ شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جان بچالی۔

حادثے کے بعد پہلا برس بہت مشکل گزرا۔ پانچ منٹ بھی مجھے نیند نہیں آیا کرتی تھی۔ ڈاکٹروں کی طرف سے دی جانے والی نیند کی گولیاں بھی بے اثر تھیں۔ یہاں کے ساتھیوں اور کراچی میں ہماری تنظیم کے لوگوں نے بہت حوصلہ دیا۔ ہر وقت چلنے پھرنے والا ایک شخص جب یکدم بستر پر آ جائے تو اس کی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میں پانچ چھ کلومیٹر پیدل چلا کرتا تھا۔ وہ بھی اس رفتار کے ساتھ کہ ہمراہ چلنے والے ساتھیوں کو یوں محسوس ہوتا کہ انہیں دوڑنا پڑے گا۔

میری زندگی میں والدین کے بعد بڑے بھائی امیر حسین کا بھی بڑا کردار ہے۔ انہوں نے ایک باپ کی طرح میرا خیال رکھا۔ ان کی شفقت کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ میری پڑھائی کے سارے اخراجات وہی اٹھاتے رہے۔ فیض آباد کے دھرنے کے دوران بھی انہوں نے قربانیاں دیں۔ اس دھرنے کے اختتام پر انہوں نے اٹک کی تاریخ کا یادگار جلسہ کیا۔ جلسے کے تمام شرکاء کے لئے اپنی جیب سے کھانے کا انتظام بھی کیا تھا۔ بڑے بھائی امیر حسین پہلے پاکستان میں ایک آئل کمپنی میں ملازمت کرتے تھے۔ اب ابوظہبی میں کام کر رہے ہیں۔

میرے بچپن اور لڑکپن کا ابتدائی دور اٹک اور جہلم کے درمیان منقسم ہے۔ جہلم میں پڑھ رہا تھا اور چھٹیاں اٹک میں اپنے گاؤں آ کر گزارا کرتا تھا۔ زندگی کے اس سنہری دور سے اگرچہ کئی یادیں وابستہ ہیں، تاہم چند واقعات اب تک ذہن پر نقش ہیں۔ ان میں دو کا تعلق مجھے دوبارہ زندگی ملنے سے ہے۔ جب میں چھٹیوں پر گھر جاتا تو اکثر گاؤں کے کنویں سے پانی بھرا کرتا تھا۔ چونکہ کنویں پر پمپ نہیں لگا تھا، لہٰذا کبھی بیل جوت کر اور کبھی ہاتھ کی مدد سے پانی نکالا جاتا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ اندھیرا تھا۔ میں نے پانی بھرنے کے لئے کنویں کی ڈور کھینچی اور کنویں کے اوپر سے چھلانگ لگا دی۔ لیکن پاؤں سرکا اور

کنویں کے اندر گر گیا۔ گرنے کے دوران میں نے بلند آواز سے ''اللہ'' کہا۔ کنویں میں ایک ''سوتر'' ہوتی ہے۔ جس نال کے ذریعے اوپر پانی چڑھتا ہے، اس کے درمیان دو لکڑیاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح ایک لکڑی کنویں کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ہوتی ہے۔ گرتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے مجھے اٹھا کر کنویں کے اندر والی لکڑی پر بٹھا دیا ہے۔ یہ یقیناً ایک معجزہ تھا۔ میں کنویں کی دیوار کے ساتھ ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ باہر نکل آیا۔ اگر میں پانی سے بھرے گہرے کنویں میں گر جاتا تو پہلے پورے گاؤں میں کہرام مچتا کہ کہاں چلا گیا۔ ہوسکتا ہے کہ کئی دن تک میرا پتہ نہ چلتا اور پھر لاش برآمد ہوتی لیکن اللہ تعالی نے مجھے بچا لیا۔ یوں ایک طرح سے مجھے دوبارہ زندگی ملی۔ گھر جا کر جب میں نے یہ سارا قصہ سنایا تو کوئی یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ اسی طرح گاؤں کے نالہ سیل میں ایک بار کافی پانی بھرا ہوا تھا۔ میں وہاں مویشیوں کو پانی پلانے گیا تو نہانے کا شوق چڑھا۔ تاہم نہاتے ہوئے گہرے پانی میں ڈوبنے لگا۔ میرے ماموں زاد ممتاز نے چھلانگ لگا کر مجھے باہر نکالا۔ یوں دوسری بار میں موت کے منہ میں جاتے بچا۔

بچپن کا ایک اور واقعہ بھی ذہن میں آج تک موجود ہے۔ ایک بار والد صاحب نے مجھے جانور چرانے کے لئے بھیجا۔ مویشیوں کے لئے والد صاحب نے نئی رسیاں بنائی تھیں۔ میں مویشیوں کو چھوڑ کر قریب سے گزرنے والے نالہ سیل کی طرف چلا گیا۔ وہاں بچے نہا رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ مل کر نہانے لگا۔ مویشیوں نے جب دیکھا کہ نگہبان موجود نہیں تو موقع سے فائدہ اٹھایا اور قریب کھڑی کسی کی فصلوں میں جا گھسے۔ دراصل میری غیر موجودگی میں میرے چچا نے مویشیوں کو بندھی نئی رسیاں کھول لی تھیں۔ یوں مویشیوں کے جدھر سینگ سمائے ادھر چل پڑے۔ میں جب گھر پہنچا تو مویشیوں کے فصل میں گھسنے کی اطلاع والد صاحب کو مل چکی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ برس پڑے اور دریافت کیا کہ ''کہاں تھے؟'' والد صاحب نے زندگی بھر مجھے نہیں مارا، اس وقت بھی صرف دھمکانے کے لئے ہاتھ اٹھایا، تا کہ اپنے غصے کی شدت کو ظاہر کرسکیں۔ بعد میں چچا نے مجھے خود بتا دیا کہ مویشیوں کی رسیاں انہوں نے اتاری تھیں اور اس کا مقصد یہ نصیحت بھرا سبق دینا تھا کہ اپنا مال (مویشی) چھوڑ کر جایا نہیں کرتے۔

اسی طرح میں 1982ء میں مری میں تیسویں ختم شریف کر کے واپس گھر پہنچا تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ ماہ رمضان چل رہا تھا۔ والد صاحب نے کہا کہ جوار و باجرہ کاشت کرنا ہے۔ صبح آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ آپ کے چچا بھی ہوں گے۔ میں بیج ڈالوں گا اور آپ ہل چلائیں گے۔ میں نے ہل چلانا شروع کیا تو رکنے کا نام نہیں لیا۔ نتیجتاً مجھے اس قدر روزہ لگا کہ والد سارا دن کنویں سے پانی لا کر پانی ڈالتے رہے۔ والدہ کو معلوم ہوا تو بہت خفا ہوئیں۔ والد سے کہا کہ میرے بچے کا کیا حال کر دیا ہے۔

دن پر لگا کر اڑتے رہے۔ 1988ء میں مدرسے سے فارغ التحصیل ہو گیا۔ قرآن حفظ کرنے کے علاوہ احادیث پڑھیں اور درس نظامی کا کورس بھی کیا۔ اس کے نتیجے میں فارسی اور عربی پر بڑی حد تک عبور حاصل ہو گیا۔ پہلی ملازمت 1993ء میں پنجاب کے محکمہ اوقاف میں کی۔ داتا دربار لاہور کے نزدیک واقع پیر کی مسجد میں جمعہ کا خطبہ پڑھایا کرتا تھا۔ یہ ملازمت اب ختم ہو چکی ہے۔ جب ملازمت ختم ہوئی تو میری تنخواہ 20 ہزار روپے ماہانہ تھی۔ اب یتیم خانہ روڈ لاہور کے قریب واقع مسجد رحمت اللعالمین میں خطیب ہوں۔ جہاں سے مجھے پندرہ ہزار روپے ماہانہ مشاہرہ ملتا ہے۔

برسر روزگار ہوتے ہی میری شادی ہو گئی۔ یہ تقریباً چوبیس پچیس برس پرانی بات ہے۔ میری شادی چچا کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ یہ وہی چچا ہیں، جنہوں نے بچپن میں مجھے نصیحت دینے کے لئے مویشیوں کی رسیاں کھول دی تھیں۔ رشتہ والد صاحب نے پسند کیا تھا۔ میرے دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ اولاد کو بھی اپنے نقش قدم پر چلایا۔ بڑے بیٹے محمد سعد بن خادم حسین کی عمر تیئس برس کے لگ بھگ ہے۔ محمد سعد اور چھوٹا بیٹا محمد انس، دونوں حافظ قرآن اور درس نظامی کا کورس کر رہے ہیں۔

مدرسے میں پڑھائی کے دوران ہی میں علامہ اقبال کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ ان دنوں میرے زیر مطالعہ غیر نصابی کتب میں اقبال کا فارسی مجموعہ کلام سرفہرست تھا۔ میں نے کلیات اقبال 1983ء میں خریدی تھی۔ یعنی نوعمری سے ہی میں نے اس قلندر شاعر کے افکار کا مطالعہ شروع کر دیا۔ یوں کہہ لیں کہ اقبال کی روح نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ اگرچہ فارسی میں نے مدرسے میں پڑھی تھی لیکن علامہ اقبال کے فارسی کلام کو اس کی روح کے مطابق سمجھنے کے لئے مجھے فارسی کی بہت سی ڈکشنریاں خریدنی پڑیں۔ بعد ازاں علامہ اقبال کے مرشد مولانا روم علیہ الرحمہ کو بھی پڑھا اور ان کا بیشتر کلام ازبر کر لیا۔ علامہ اقبال،

مولانا روم علیہ الرحمہ کو اپنا پیر و مرشد قرار دیتے تھے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں (ترجمہ) میں مولانا روم علیہ الرحمہ کے مے خانے سے عشقِ رسول ﷺ کی وہ مے لایا ہوں جس کی مستی کے آگے انگور کی شراب کوئی حیثیت نہیں رکھتی" حافظ شیرازی اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی علیہ الرحمہ کی شاعری بھی میں نے پڑھی۔ اگر اردو کے شعرائے کرام کی بات کی جائے تو اکبر الہ آبادی کی شاعری پسند آئی۔ ان کے زمانے میں ایک تھانیدار نے اپنی کوٹھی بنائی تھی۔ اس حوالے سے ہونے والی تقریب میں اکبر الہ آبادی کو بھی مدعو کر لیا گیا۔ تھانیدار کا اصرار تھا کہ نئی کوٹھی پر بھی ایک شعر ہو جائے۔ اکبر الہ آبادی نے کہا کہ رہنے دیں۔ آپ کا سارا مزہ خراب ہو جائے گا۔ اصرار بڑھا تو انہوں نے یہ شعر سنا دیا۔

یہ کوٹھی جو تم کو نظر آ رہی ہے
اور اپنی اداؤں پر اترا رہی ہے
اگر اس کے گملوں کی خوشبو کو سونگھو
تو خونِ غریباں کی بو آ رہی ہے

پہلے مطالعہ کو بہت زیادہ وقت دیا کرتا تھا۔ گھر میں کیبل اور ٹی وی یا نیٹ تو نہ تھا اور نہ ہے۔ صرف اخبار پڑھا کرتا تھا۔ لیکن تحریک کی مصروفیات بڑھ جانے کے سبب مطالعہ کا زیادہ وقت نہیں ملتا۔ سفرناموں کا بھی بڑا شوق رہا۔ حکیم محمد سعید اور مفتی احمد یار خان کے تمام سفرنامے پڑھ ڈالے۔ تاریخِ اسلام کا مطالعہ بھی میری ترجیح تھی۔ اسلام کے تمام سپہ سالار اپنی مثال آپ ہیں۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے متاثر کیا۔ ان کے مزار پر حاضری ایک دیرینہ خواہش تھی۔ قریباً دس برس پہلے یہ خواہش پوری ہوگئی۔ میں نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مزار کے ساتھ کاندھا کر دو نفل اور تین وتر پڑھے۔ قصہ اس اجمال کا یوں ہے کہ جب ہم مزار پر پہنچے تو دروازہ بند کیا جا رہا تھا۔ ہمارا وہاں قیام کا آخری روز تھا۔ یعنی اگر اس دن مزار میں داخل ہونے سے رہ جاتے تو بغیر دیدار کے واپس جانا پڑتا۔ ہم دروازے پر پہنچے تو دریافت کیا گیا کہ کہاں سے آئے ہو؟ ہم نے بتایا کہ پاکستان سے۔ دروازے پر کھڑے شخص نے فوری دروازہ کھول دیا اور بولا "سرکاری طور پر وقت ختم ہو گیا ہے لیکن آپ جلدی سے اندر آ جائیں" ہم اندر داخل ہوئے۔ یعنی غیر متوقع طور پر ہماری شکلیں دیکھ کر

دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ میں آج بھی سوچتا ہوں کہ شاید خالد بن ولید رضی اللہ عنہ انتظار کر رہے تھے کہ ان کے مہمان آ رہے ہیں۔ مزار میں داخل ہونے کے بعد ہم نے گرم پانی سے وضو کیا اور پھر نفلیں پڑھیں۔ اندر داخل ہو کر مجھے خوشی بھی ہوئی اور رونا بھی آیا۔ خوشی اس لئے کہ تاریخ اسلام کے اتنے بڑے سپہ سالار کے سامنے مجھ جیسے بزدل شخص کی حاضری ہوئی۔ رونا اس لئے آیا کہ باپ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور بیٹے عبدالرحمن بن خالد رضی اللہ عنہ کی قبریں ایک ساتھ ہیں۔ وطن کون سا تھا اور تدفین کہاں پر ہوئی۔

پرسکون زندگی ایک ڈگر پر چل رہی تھی۔ میں درس و تدریس کے علاوہ ولی مسجد میں جمعہ کا خطبہ دیتا تھا۔ ممتاز قادری کی گرفتاری اور پھر پھانسی نے میری زندگی میں ہلچل پیدا کر دی۔ ممتاز قادری نے ایک گستاخِ رسول گورنر کو گولیاں مار کر مسلمانوں کا سر فخر سے بلند کر دیا تھا۔ ممتاز قادری نے جس محبوب ﷺ سے وفا کی۔ قیامت تک حضور ﷺ کی امت اس پر ناز کرتی رہے گی۔ لیکن حکومت نے اس عاشق رسول ﷺ کو جیل میں ڈال دیا۔ ممتاز قادری کی رہائی کے لئے ہم نے تحریک چلائی اور مظاہرے کئے۔ اسی حوالے سے کئے گئے ایک مظاہرے کے دوران پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا۔ جب مجھے گرفتار کر کے لے جایا جا رہا تو میری ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ایک پولیس افسر نے طعنہ دیا کہ "تم کیا نبی ﷺ کے ٹھیکیدار ہو۔ جب بھی تمہاری تقریر سنو۔ ناموسِ رسالت ﷺ پر بات کرتے ہو۔ تمہیں اور کوئی موضوع نہیں ملتا؟" میں نے اسے کہا کہ "نبی ﷺ کے ٹھیکیدار تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی نہیں تھے۔ انہوں نے بھی فرمایا تھا کہ لوگو! میرے پیچھے اس وقت تک چلنا، جب تک میں رسول ﷺ کے پیچھے چلوں۔ لہٰذا میں نبی ﷺ کا ٹھیکیدار نہیں، چوکیدار ضرور ہوں"

بعد ازاں مجھے کوٹ لکھپت جیل پہنچایا گیا تو جیل سپرنٹنڈنٹ نے دریافت کیا "کیا کرتے ہو؟" میں نے کہا "مسجد میں جھاڑو دیتا ہوں" جیل سپرنٹنڈنٹ نے اپنے نائب سے پوچھا "کیا لکھوں؟" وہ بولا "سر جی! موذن لکھ چھوڑو" جیل سے رہا ہوا تو اگلے روز ممتاز قادری کا خط مجھے ملا۔ جمعہ کا روز تھا۔ نماز سے قبل یہ خط ممتاز قادری کے والد اور بھائی لے کر آئے تھے۔ یہ خط آج بھی میرے پاس محفوظ ہے اور میں اس خط کو اپنی بخشش کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ یہ بڑا طویل خط ہے، لیکن اس کا ایک جملہ قابلِ توجہ ہے۔

ممتاز قادری نے لکھا۔۔۔۔ ''مولانا جب آپ کوٹ لکھپت جیل میں قید تھے تو میں آپ کے ساتھ تھا'' اس وقت تو مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ ممتاز قادری تو اڈیالہ جیل راولپنڈی میں ہیں اور میں کوٹ لکھپت جیل میں تھا تو وہ میرے ساتھ کیسے ہو گئے؟ لیکن بعد میں سمجھ آیا کہ ممتاز قادری جسمانی طور پر تو نہیں، لیکن روحانی طور پر میرے ساتھ ضرور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سرد ترین موسم میں بھی، جب جیل انتظامیہ نے مجھے ٹھنڈ سے بچنے کے لئے خاطر خواہ چیزیں نہیں دی تھیں، پھر بھی سلاخوں کے پار سے سرد ہوائیں مجھ تک نہیں آ رہی تھیں۔ اسی طرح مجھے یاد آیا کہ ایک رات جیل میں مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور پریشانی تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ یکدم میرے دل میں خیال آیا کہ میری ٹانگیں بغداد شریف کی طرف ہیں، ان کو دوسری سمت میں کروں۔ ٹانگیں دوسری سمت میں کرتے ہی مجھے گہری نیند آ گئی۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ یہ ممتاز قادری تھے جنہوں نے میری ٹانگوں کو صحیح سمت میں کرایا۔

ناموس رسالت ﷺ قانون کے تحفظ کے لئے چلائی جانے والی تحریک کے دوران محکمہ پنجاب اوقاف کی طرف سے مجھے کہا گیا کہ میں یہ سلسلہ روک دوں۔ ورنہ ملازمت چھوڑنی پڑے گی۔ قصہ مختصر سرکاری حکم تھا کہ آپ ناموس رسالت ﷺ پر بات نہیں کر سکتے۔ میرے انکار پر ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس ملازمت کو چھوڑے لگ بھگ تین برس ہو چکے ہیں۔ برطرفی کے بعد میرے پاس صوبائی خطیب آئے اور کہا کہ حکومت آپ کو پنشن دینے کے لئے تیار ہے اور چونکہ آپ معذور ہیں، لہذا پوری تنخواہ کے برابر پنشن ملے گی، جبکہ بڑے بیٹے کو محکمہ اوقاف میں ملازمت بھی دی جائے گی۔ میں نے کہا، اب کچھ نہیں چاہئے۔

جب ممتاز قادری کو گرفتار کیا گیا تو ناموس رسالت قانون کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ہم نے ممتاز قادری کی رہائی کی تحریک بھی شروع کر دی۔ یہ تحریک چلتی رہی۔ ریلیاں اور جلسے جلوس نکالے گئے۔ گرفتاریاں بھی ہوئیں۔ تاہم چند ماہ بعد عدالت نے ممتاز قادری کو پھانسی کی سزا سنا دی اور پھر 2015ء کے اواخر میں پھانسی کی سزا کے خلاف اپیل بھی مسترد کر دی گئی۔ اب گیند صدر کے کورٹ میں تھی کہ وہ اپیل مسترد کرتے ہیں یا منظور۔ ہمارا احتجاج جاری تھا۔ اس دوران حکومت نے وزیر مملکت برائے مذہبی امور پیر امین الحسنات شاہ کے ذریعے پیغام بھیجا کہ ممتاز قادری کو پھانسی نہیں دی جائے گی۔ ہمیں

سیکریٹریٹ بلایا گیا تھا۔ وہاں ایک صوبائی وزیر اور آئی جی پنجاب کے علاوہ اکتوبر 1999ء سے پہلے آئی جی سندھ رہنے والے رانا مقبول بھی موجود تھے۔ ہماری طرف سے قاری افضل قادری اور دیگر تھے۔ بالخصوص رانا مقبول یہ شعر پڑھ رہے تھے:

با خدا دیوانہ باش، با محمد ﷺ ہشیار

اور کہہ رہے تھے کہ عشق رسول ﷺ بڑا حساس مسئلہ ہے۔ اس پر کیسے کمپرومائز کیا جاسکتا ہے۔ کہنے کا مطلب ہے کہ پیر امین الحسنات اور ان کے ساتھ جتنے لوگ موجود تھے، ان سب کا کہنا تھا کہ وزارتیں اور عہدے بعد میں ہیں، پہلے ہم حضور ﷺ کے غلام ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ ممتاز قادری کی پھانسی کے معاملے کو طوالت دی جائے گی اور پھر کچھ عرصے بعد رہا کر دیا جائے گا۔ لیکن ان کے لہجے چغلی کھا رہے تھے اور میں سمجھ رہا تھا کہ یہ دو نمبری کر رہے ہیں۔ تاہم میں خاموش رہا کہ اگر بولا تو ان ساروں کی پریشانی بڑھ جائے گی۔ میں ان کی طرف دیکھتا تو وہ نظریں نیچی کر لیتے۔

بعد ازاں یہی ہوا جس کا اندازہ مجھے کسی حد تک ہو چکا تھا۔ صدر مملکت کے پاس پھانسی کے مجرموں کی ہزاروں اپیلیں پہلے سے پڑی تھیں، لیکن ان اپیلوں کو پس پشت ڈال کر ممتاز قادری کی اپیل کو مسترد کر دیا گیا۔ یہ سراسر بدنیتی تھی۔ بالآخر عاشق رسول ﷺ کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ ہم ہر طرح کی کوششوں اور قید کی صعوبتیں اٹھانے کے باوجود ممتاز قادری کو نہ بچا سکے۔ دل پر بڑا بوجھ تھا۔ ممتاز قادری کا جسد خاکی لایا گیا تو میں نے جا کر اپنی پگڑی ممتاز قادری کے قدموں میں رکھ دی۔ چارپائی کو بھی کئی بار چوما اور کہا کہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں جا کر ہماری شکایت نہ لگانا۔ ہم سے جو ہو سکا ہم نے کیا۔

ممتاز قادری اپنے اہل خانہ سے آخری ملاقات میں روئے نہیں۔ پھانسی گھاٹ کی طرف جاتے ہوئے بھی مسکرا رہے تھے۔ ان کے والد نے بھی ایک آنسو نہیں بہایا کہ کہیں وہاں موجود مخالفین باہر جا کر یہ پروپیگنڈہ نہ کریں کہ ممتاز قادری اور ان کے والد آخری وقت ہمت ہار گئے۔ بیٹا چالیس روز کا بھی نہیں ہوا اور باپ جیل چلا جائے اور پھر اسی پانچ سالہ بیٹے سے آخری ملاقات میں اسے گلے لگا کر باپ مسکرا دے۔ یہی ممتاز قادری نے کیا۔ علامہ اقبال کہہ گئے ہیں کہ انسان دلیری اس وقت ہوتا ہے، جب سینے میں محبت رسول ﷺ ہو۔

علامہ خادم حسین رضوی کے ساتھ گفتگو کے موقع پر ان کے ایک دیرینہ ساتھی جیلان شاہ بھی موجود تھے۔ جیلان شاہ فیض آباد دھرنے کا آخر تک حصہ رہے۔ علامہ صاحب کی اجازت سے اس سوال کا جواب انہوں نے دیا کہ پولیس والے پسپا کیسے ہوئے؟ ان کی زبانی سنئے۔

اس پورے آپریشن میں دو بار اسٹاپ اوورآیا تھا۔ اس کا دورانیہ ساڑھے چار گھنٹے سے پونے پانچ گھنٹے کا بنتا ہے۔ اس دوران ایک بار پولیس والے فیض آباد کی طرف سے آئے۔ انہیں پسپا کر دیا گیا۔ پھر دوسری بار یہ بارہ اطراف سے آئے۔ کنٹینر کے عقب سے بھی گھیراؤ کیا، لیکن اس کے باوجود دھرنے کے شرکاء نے انہیں دوبارہ پیچھے دھکیل دیا جس کے بعد پندرہ منٹ کے وقفے سے پولیس والوں نے تیسری بار حملہ بولا۔ یہ ان کی پوری طاقت کے ساتھ حتمی کارروائی تھی۔ اس وقت تک بے انتہا شیلنگ نے شرکاء کو نڈھال کر دیا تھا کیونکہ آنسو گیس کے شیل انسان کے سانس کو روک دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں خون کا بہاؤ متاثر ہوتا ہے۔ پولیس کی جانب سے فائر کئے جانے والے بارہ ہزار سے زائد شیل ہم نے خود گنے تھے۔ انتہائی نزدیک سے ربڑ کی گولیاں الگ چلائی جارہی تھیں۔ صورتحال یہ تھی کہ پولیس والے کنٹینر کی ڈرائیونگ سیٹ والے حصے کے نزدیک آچکے تھے۔ ان کے واٹر کینن ہمارے کنٹینر سے ٹکرا رہے تھے۔ کنٹینر کے عقب میں فیض آباد والی سائیڈ پر بھی، جہاں استاد صاحب (علامہ خادم حسین رضوی) موجود تھے، پولیس والے چند گز کے فاصلے پر آچکے تھے۔ اس دوران وہ ہمارے ایک ایک خیمے کی تلاشی لینے کے بعد انہیں نذرِ آتش کر کے آگے بڑھ رہے تھے۔ لیکن اس وقت تک بھی استاد صاحب یہ حکم جاری کر رہے تھے کہ ہم نے ان پر ہاتھ نہیں اٹھانا۔ پونے پانچ گھنٹے کی مسلسل شیلنگ سے لڑکے اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہے تھے۔ البتہ ہمیں یہ پریشانی ضرور تھی کہ استاد صاحب کو کچھ نہ ہو جائے۔ جب پولیس والے ہمارے بالکل قریب آگئے تو یہی وہ مرحلہ تھا جب بالآخر استاد صاحب نے گرجدار لہجے میں کہا "منڈیو پھڑ لو انہاں نوں" (لڑکوں انہیں پکڑ لو) کنٹینر پر ہمارے جو قائدین تھے اور نیچے نڈھال کارکنان۔ استاد صاحب کے ان الفاظ نے گویا ان میں بجلی بھر دی۔ پھر لڑکوں نے نہیں دیکھا کہ آگے

کون ہے اور کون نہیں۔ پولیس کے پیچھے دوڑ لگادی۔ یوں پانسہ پلٹا۔ یہ جو پروپیگنڈہ کیا گیا تھا کہ عقب سے دھرنے والوں کو "غیبی امداد" آئی۔ یعنی اشارہ اسٹیبلشمنٹ کی طرف تھا۔ حالانکہ اس میں ایک فیصد بھی حقیقت نہیں۔ عقب سے امداد ضرور آئی تھی لیکن وہ عام لوگوں کی تھی۔ جو گھروں میں بیٹھے ٹی وی پر یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ جب کنٹینر کے پاس سے پانسہ پلٹا تو ہمارے ناکوں کے پیچھے سے عوام آنا شروع ہوگئے۔ ہم مری والی سائیڈ پر تھے۔ اس سائیڈ پر ہمارے تقریباً تمام لڑکے گرفتار ہو چکے تھے۔ لیکن پھر گھروں سے اچانک اتنی مخلوق نکلی کہ پولیس ان گرفتار لڑکوں کو چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ یہاں تک کہ اپنی گاڑیاں بھی چھوڑ گئی۔ ان آنے والوں میں ایک لڑکا ایسا بھی تھا جو صبح ناشتہ کر رہا تھا۔ جب اس نے ٹی وی پر دیکھا کہ آپریشن شروع ہوگیا ہے، تو ناشتہ چھوڑ کر اپنی والدہ سے کہا کہ "اماں اب بعد میں ملاقات ہوگی، میں جارہا ہوں" راجہ زیب نے 27 منٹ میں شہادت حاصل کی۔ وہ راولپنڈی میں اپنی دکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ آپریشن کا سنتے ہی اس نے دکان کا شٹر بند کیا اور فیض آباد کی طرف چل پڑا۔

دھرنے کے حوالے سے ایک اور واقعہ سناتا چلوں۔ میرا بھائی آسٹریلیا سے آیا تھا۔ وہ استاد صاحب کا مداح ہے۔ ہمارے ساتھ دھرنے میں چلا آیا۔ دھرنے کے پہلے روز رات ڈھائی بجے جب ہم فیض آباد پہنچے تو کنٹینر سے لڑکے میوے کا لنگر بانٹ رہے تھے۔ بھائی نے کہا کہ میں نے بھی کنٹینر کے اوپر جانا ہے۔ پھر وہ بھی لڑکوں کے ساتھ مل کر لنگر بانٹنے لگا۔ صبح چار ساڑھے چار بجے کے قریب جب رش ختم ہوا تو ہم نیچے آکر کھڑے ہوگئے۔ بھائی نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر انگڑائی لی تو اس کا پیر نیچے سوئے ہوئے شخص کے ساتھ ٹکرایا۔ اس نے اپنے ساتھ کھڑے لڑکے سے پوچھا۔ اتنی سردی میں کھلے آسمان تلے کمبل اوڑھے یہ کون سو رہا ہے؟ اسے بتایا گیا کہ "استاد صاحب" ہیں۔ بھائی کو یقین نہیں آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ واقعی "استاد صاحب" ہیں۔ میں نے بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اس میں چونکنے کی کیا بات ہے۔ یہ کہہ کر میں نے اوپر سے کمبل اٹھایا تو نیچے "استاد صاحب" سو رہے تھے۔ بھائی کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ کہنے لگا میرے لئے یہ ناقابلِ یقین بات ہے کہ ایک لیڈر عام کارکنوں کی طرح نیچے سو رہا ہو، حالانکہ کنٹینر موجود تھا اور سامنے ہوٹل بھی تھے۔ جہاں رات کو کچھ دیر آرام کی خاطر استاد صاحب جاسکتے تھے۔